دینے لگیں کہ میں نے انہیں کہا تھا کہ کل اسے اتنا نہ سجاؤ' سنوارو اسے کسی کی نظر نہ لگ جائے یہ تو خود ہی چاند ہے مگر کسی نے میری نہ مانی' ان کا خیال تھا کہ میں جو بے ہوش تھی تو ضرور کسی کی نظر لگ گئی تھی کیونکہ جنات تو سید زادیوں پر آ نہیں سکتے (اب انہیں کیا پتہ کہ رُودین تو آ سکتے ہیں جو جنات سے بھی زیادہ آفت چیز ہوتے ہیں) اور انہوں نے تیار ہو جانے کے بعد فوراً مجھے اور ناصر کو دربار پر بابا کے پاس حاضری کو لے جانے کا پروگرام بنالیا تھا حالانکہ رسم کے مطابق ہمیں ولیمے کے بعد جانا تھا۔ اور جب ہم بابا کے پاس گئے اُن کے قدموں کو میں نے چھوا' انہوں نے اپنی شفیق' پُر سکون گہری آنکھوں سے مجھے دیکھا' میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں تو ایک بار پھر مجھے کچھ ہونے لگا۔ میری آنکھوں سے خاموش آنسو خود بخود بہنے لگے اور میں نے بابا کا ہاتھ تھام لیا۔ میں رونے لگی ان کے ہاتھ پر آنکھیں رکھ کر اور میرا دل چاہا کہ ان سے کہوں مجھے صرف ایک دعا دیں صرف ایک دعا کہ میں مر جاؤں یہیں اسی وقت یہاں دربار میں آپ کے سامنے' آپ کے قدموں میں۔ (پتہ نہیں میں بابا کے معاملے میں بھی اتنی رومنٹیک کیوں ہوں) مگر میں نے دیکھا کہ میرے آنسوؤں پر پھر دیکھنے والوں کو حیرت اور تجسس ہے' باجی اور پھوپھو کی آنکھوں میں تنبیہ ہے تو میں چپ ہو گئی۔ بابا نے ایک لڈو توڑ کر اپنے ہاتھ سے مجھے اور ناصر کو آدھا آدھا کھلایا اور میں نے.... بڑے سکون سے تصور کیا کہ اس وقت اگر بابا کے یوں دائیں بائیں ناصر کے بجائے میں اور تم بیٹھے ہوتے' بابا یوں آدھا لڈو تمہیں کھلاتے.... تو کیا تب بھی میں اسی طرح روئی ہوتی.... کیا تب بھی میں نے اسی طرح صبح سویرے ڈرامہ کیا ہوتا اور کیا تب بھی.... میں اپنے اندر یوں مردہ' تنہا اور فروخت شدہ محسوس کرتی خود کو.... کیا تب بھی گھر چھوڑنے کا دکھ یونہی ہوتا؟ اوہ! تم ہی بتاؤ کہ کیا واقعی تب بھی یونہی ہوتا؟ مجھے تو لگتا ہے کہ نہیں۔ تب تو تمہیں پا لینے کا سکھ' اپنا آپ تمہارے سپرد کر دینے کا سکھ' تمہارے ''ساتھ'' کا سکھ' باقی سب چھوٹے چھوٹے دکھوں پر حاوی آ جاتا.... اور میں یوں صبح روتے ہوئے اُٹھنے کی بجائے چاہتی کہ اُٹھوں ہی نہیں۔ صبح آئے ہی نہیں ہمیں اٹھانے کے لیے جدا کرنے کے لیے۔ اور ایک اپنی بہت بے ہودہ آرزو آپ کو بتاؤں کہ جس رات

میری مہندی تھی اور صبح بارات تھی اُس رات ایک تو ہنگامہ ہی رات بارہ بجے تک رہا پھر بعد میں بھی مجھے نیند نہ آ سکی تھی۔ یہ خیال تھا کہ بس یہ میری آخری رات ہے یہاں اس کے بعد... کل میں وہاں ہوں گی۔ دن مقرر ہونے اور مائیوں کی رسم کے بعد سے گھر چھوڑنے کا دُکھ اپنوں سے جدا ہونے کا دُکھ اس رات مجھ پر پوری طرح حاوی ہوا تھا (ورنہ تو آپ کو بتاؤں کہ میں تو مائیوں بیٹھ کر زرد جوڑا پہن کر مزے سے فنون کا سالنامہ اور قرۃ العین کی ''آگ کا دریا'' اور ''سرخ و سیاہ'' نامی ناولیں پڑھتی رہی تھی۔ اور ان میں اس طرح گم ہوگئی تھی کہ مجھے یوں لگتا تھا کہ یہ سب تیاریاں کسی اور کی ہیں' کسی اور کی شادی ہے' کسی اور کو زرد جوڑا پہنا کر بٹھایا گیا ہے فرش پر۔ میں تو بس ژولیان اور ماتیلا اور گوتم نیلمبر چمپا اور قراۃ العین کے ساتھ ساتھ مشہد' فرانس' لکھنؤ اور لندن میں ہوں۔ وہ لڑکی کوئی اور ہے جسے رخصت ہو جانا ہے اگلے ہفتے اور کتنی رومنٹیک اور انوکھی بات ہے آپ کو بھی شاید ہنسی آ جائے کہ ایسے مائیوں کوئی لڑکی نہ بیٹھی ہوگی کہ سہیلیاں منہ کے آگے ڈھولک رکھے گا رہی ہیں ع

کھول ہریالی گھونگھٹ کھول

اور ''ہریالی'' صاحبہ (ویسے یہ ہریالی پتہ نہیں کیا معنی رکھتا ہے) سفرنامے میں گم ہیں اور تصور کر رہی ہیں کہ تم اور تمہارا سکھ' دوست کس طرح ان کے اجداد کے ملک ایران کے ایک گرد وارے میں مسکین صورتیں لیے بیٹھے ہیں اور یہ جنات سے بھی آفت ترشے تم ان کے آبائی شہر مشہد میں کس طرح مزے سے گھوم رہا ہے (بے مروت اور خوش قسمت انسان.... کیونکہ تم اُس وقت مشہد میں یقیناً میرے تصور کے بغیر گھوم رہے ہوگے... اور شاید اگر آئندہ بھی اتفاق ہو تو ایسا ہی کرو گے۔) اور ایک دن جب میری کچھ سہیلیاں عین میرے کان پر ڈھولک پیٹ پیٹ کر ایک گیت گا رہی تھیں تو صرف تھوڑی دیر کو میں گوتم نیلمبر اور چمپا اور نرملا اور کمال اور ہری شنکر کے نرغے سے نکل آئی تھی چونک کر۔ وہ گا رہی تھیں

بنو تیرے بابا کی اُونچی حویلی۔ بنو میں پوچھتا چلا آیا

''کیا بکواس ہے'' میں نے ایک دم چیخ کر کہا تھا۔ ہنس کر کہا تھا کہ کیا

بکواس ہے وہ تو بچپن سے میرے بابا کی حویلی کی اینٹ اینٹ سے واقف ہے۔ اُسے کسی سے پوچھتے ہوئے آنے کی کیا ضرورت۔ وہ کوئی غیر تھوڑا ہی ہے۔ اور دل میں میں نے سوچا تھا اپنی سہیلیوں کی اب شروع ہونے والی چھیڑ چھاڑ سے مکمل طور پر بے نیاز ہو کر آنکھیں بند کر کے تھک کر لیٹ جانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے سوچا تھا کہ اگر تم آتے تو واقعی تمہیں میرے بابا کی اس واقعی اونچی حویلی کا پتہ پوچھنا پڑتا کیونکہ تم رومیوں کے گھرانے سے اُٹھ کر نہیں بلکہ راوی، ستلج، چناب سب کے پار سے سوہنی کے دیس سے آتے.... مگر تم تو ہو ہی بے مروت۔ میں نے بے اختیار سوچا تھا، یاد کیا تھا کہ تم نے تو ایک بار بھی اس طرف آنے کی خواہش کا ذرا سا بھی اظہار نہ کیا تھا۔ میں لاکھ جتن کے باوجود ہزاروں خواہشوں کے باوجود لاہور نہ آ سکتی تھی.... لیکن تم تو ادھر آ سکتے تھے مرد تھے اور بقول تمہارے یہ معاشرہ ہے ہی مردوں کا جو چاہے کر سکتے ہیں (اور یہ سچ بھی ہے) شاید تم آتے تو ہم پروگرام کوئی بنا لیتے اور اجنبیوں کی طرح ہماری کسی بک اسٹال پر ملاقات ہو سکتی۔ میں تم سے دو چار باتیں بھی کر لیتی صرف یہ ظاہر کر کے کہ اچانک نظر آ گئے ہو مگر تم نے ایسا کبھی نہ سوچا، کبھی ادھر آنے کی خواہش نہ کی.... اور اب بھی ایسا کبھی نہ کرو گے۔ مجھے معلوم ہے.... پھر اب تو ایسا کرنے کا فائدہ بھی کیا.... میں مر چکی ہوں۔

اور اس رات مہندی والی رات جس کی صبح بارات آنی تھی میں سو ہی نہیں سکی تھی اور علاوہ دوسری کئی باتوں کے پتہ نہیں رات کے کس وقت ایک وحشیانہ اور احمقانہ خیال مجھے بے اختیار یہ آیا تھا کہ کاش صبح سے پہلے کسی طرح کسی جادوئی طریقے پر میں وہاں پہنچ سکتی جہاں تم ہو اور تم سے کہتی وہ جو میں نے پتہ نہیں کہاں پڑھا تھا کہ Dont Spare Me پتہ نہیں اس کا اردو ترجمہ کیا ہوگا۔ میں کہتی کہ اس سے پہلے کہ صبح ہو، اس سے پہلے کہ وہ مجھے لے جائے اور کل کی رات آئے.... تم مجھ سے وہ سب کچھ لے لو.... جسے میں نے صرف تمہاری امانت سمجھا ہے۔ میرا غرور اور میرا حسن اور میری نسوانیت اس سے پہلے کہ یہ اُس کے اختیار میں جائے تم اسے قبول کر لو.... اور پھر صبح سے پہلے میں واپس بھی آ جاتی مطمئن اور مسرور۔ مگر ایسا بھلا کب ہوتا ہے ہم بے چارے، بے حقیقت مجبور انسان ہم سوچ تو سکتے ہیں۔

مجھے پتہ چل گیا تھا کہ آنسو لوگوں کو شک میں مبتلا کر دیتے ہیں حتیٰ کہ میری امی تک کو۔ اس لیے میں مسلسل بہت خوش ہونے کی ایکٹنگ کیے جا رہی ہوں۔ اور کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ یہ اداکاری نہیں حقیقت بھی ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ میں مکمل خوش تو کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے' اس کی قربت اچھی لگتی ہے' کبھی کبھی وہ سامنے نہیں ہوتا تو لگتا ہے کہ کچھ کمی ہے کہیں.... اور جب وہ مجھے... چھوتا ہے' پیار کرتا ہے' چومتا ہے تو یہ خیال میرے ذہن میں فوراً لہرانے لگتا ہے' فوراً سوچنے لگتی ہوں کہ کیا تمہارا پیار کرنے کا انداز بھی ایسا ہوتا ہوگا! کیا تم بھی یونہی بوسہ لیتے ہوگے ''کسی'' کے ہونٹوں اور رخساروں کا۔ یونہی تعریف کرتے ہوگے کسی کی گردن کی.... شاید اس سے کہیں زیادہ خوبصورتی اور شاعری سے.... اور میں سوچتی ہوں اکثر سوچتی ہوں کہ کیا یہ بھی ممکن نہ تھا کہ تم نے ایک دفعہ... صرف ایک دفعہ... مجھے صرف چوما ہی ہوتا... کبھی میرے صرف ہاتھ ہی اپنے ہاتھ میں لیے ہوتے لیکن ہم تو وہ لوگ ہیں جو کبھی ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکے۔ (اور یہ سب کچھ لکھتے ہوئے میں سوچ رہی ہوں کہ شادی انسان کو کتنا بے حیا' بے باک اور بااعتماد بھی اور تجربہ کار بھی بنا دیتی ہے) مگر کبھی ناصر بہت اُکتا دیتا ہے مجھے ہر چیز سے' خود سے اور اس سے بھی۔ شادی کے ایک ہفتے بعد ہم مری گئے اور ایوبیہ اور نتھیا گلی اور وہاں سے ایبٹ آباد اور پھر دس دن بعد گھر واپس۔ ایوبیہ اور ایبٹ آباد میں ہم کسی کے گھر ٹھہرے اور مری اور نتھیا گلی میں ہوٹل میں۔ ہم صبح یا شام یا رات کو سیر کو نکلتے یا میں ہوٹل کی گیلری یا کھڑکی سے باہر کا بے پناہ حسن دیکھتی' ہر پل خدا کی قسم میرا جسم ناصر کے ساتھ ہوتا اور ذہن کہہ رہا ہوتا کہ جتنا شدید حسن ہے یہاں ہر چیز کا.... اتنا ہی شدید خیال آتا ہے تمہارا۔ یاد آتا تھا کہ تم نے لکھا تھا کہ تم بھی شادی کے بعد یہاں آئے تھے اور میں سوچتی ان وادیوں' ان راستوں' ان پہاڑوں پر تم پتہ نہیں کہاں کہاں پھرے ہوگے' کہاں کہاں رُکے ہوگے اور تم نے اُس سے کیا کیا کہا ہوگا جو تمہاری بیوی ہے۔ اور پھر میرا دل آپ ہی آپ ڈوبتی ہوئی اکیلی شام جیسی اُداسی سے بھر جاتا تھا اور میں سوچتی تھی تمہیں کیا خبر ہوگی' کیا خیال ہوگا کہ کوئی تمہیں اب بھی یوں مِس کر رہا ہے۔ تم تو مزے سے اپنے خوبصورت انداز میں

اپنے دوستوں سے کہیں باتیں کرتے ہو گے' اپنے بچوں کے ساتھ ہنستے ہو گے' اپنا خوبصورت سر جھکائے انہماک سے کچھ لکھتے یا پڑھتے ہو گے یا پھر اپنی بیوی کے ساتھ ہو گے اور تمہیں میرا خیال تک نہ آتا ہو گا۔ بالکل ایسا تھا ناں؟ یقیناً تھا کیونکہ ہونا ہی ایسا چاہیے تھا.... اور تم ہو ہی بالکل ایسے۔ میرا خیال ہے کہ رانجھے کی وبھلی میں جو اثر تھا وہ تمہارے قلم اور تمہاری تحریر میں ہے۔ وہی جادو' وہی سحر ہے جس میں محسوس ہوتا ہے کہ میں تمہیں ہمیشہ سے صدیوں سے جانتی تھی۔ سوچتی ہوں شاید تمہیں یہ خیال آیا ہو کبھی کہ بس میں بھی عام لڑکیوں کی طرح اب شادی کی مسرتوں میں گم ہو چکی ہوں گی اور تم کو بھول چکی ہوں گی.... لیکن تمہیں صرف اب ہی نہیں ہمیشہ سالوں بعد بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تمہیں جب بھی کوئی ایسا خیال آئے گا وہ بے معنی اور غلط ہو گا' جھوٹ ہو گا۔ کبھی بھی اور کہیں بھی تمہیں بھلانا ناممکن ہی نہیں خلاف فطرت ہے۔ میں نے پڑھا تھا کہ محبت چاہت ہر چیز کے حسن کو بڑھا دیتی ہے اور جب تمہارا خط آتا تھا تو مجھے ایک دم سے احساس ہوتا تھا کہ پھول اور آسمان اور کھیت اور درخت ہر چیز کتنی خوبصورتی لیے ہوئے ہے۔ عام دنوں سے زیادہ دلکش ہے ہر چیز.... لیکن اب تو میں نے تمہارا ہر خط پھاڑ ڈالا ہے' مجبور ہو کر' بے بس ہو کر جس دن مجھے مائیوں بٹھایا گیا تھا اُس دن میں نے شدید ظلم کیا تھا خود پر اور حسبِ عادت بہت روئی تھی' بہت بیزار رہی تھی اپنے آپ سے مگر ایسے میں کتابوں اور ''فنون'' نے مجھے بڑا سہارہ دیا تھا اپنے آپ کو بھول جانے میں.... مگر پتہ نہیں کیوں ایسا لگتا ہے کہ جیسے تم نے میرے خطوط نہیں پھاڑے ہوں گے.... تم انہیں نہیں پھاڑ سکتے کیونکہ تم میری طرح مجبور اور بے بس نہیں ہو.... اور پھر میرے خطوں میں سچائی ہے' جذبہ ہے' حسن ہے اور کیا یہ چیزیں ضائع کر دینے کے لیے ہوتی ہیں! کیا تم نے انہیں ضائع کر دیا ہے' شاید کر دیا ہو کیونکہ ایک مرتبہ تم نے مجھے لکھا تھا کہ کاغذ پر پھیلی ہوئی سیاہی اور الفاظ کا فائدہ! تمہارے لیے شاید یہ صرف سیاہی ہی ہو گی لیکن میرے لیے تو اس میں جو جذبہ اور سچائی اور حسن ہے شاید تم اسے سمجھنا نہیں چاہتے۔ کیا تم نے انہیں پھاڑ ڈالا اور ضائع کر دیا ہے؟ دل چاہتا ہے کہ تم نے ایسا نہ کیا ہو شاید ان کے حوالے سے ہی تم مجھے یاد رکھ سکو.... ہمیشہ.... زندگی بھر۔ کچھ لکھ سکو!

اب میں تو تمہارا خط' تمہاری تحریر پتہ نہیں کبھی پڑھ سکوں گی یا نہیں (تمہاری وبجھلی کبھی سن سکوں گی یا نہیں) لیکن ایسا لگتا ہے کہ جب بھی وقت ملا تمہیں لکھے بغیر رہوں گی نہیں۔

ناصر اتنا اچھا اور پُرخلوص ہے کہ میں اُسے کوئی تکلیف پہنچانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی یا اُس سے بدخلوص ہونے کا۔ لیکن آپ سے باتیں کرنا تو کوئی بدخلوصی یا بے وفائی نہیں ہے ناں؟

آپ نے بھی ''سرخ وسیاہ'' پڑھ رکھی ہوگی۔ میں جب پچھلے دنوں ہاتھ میں بندھے ہوئے بہت سے گانوں یا کنگنوں اور زرد جوڑے کے ساتھ یہ کتاب پڑھتی رہی اور میری سہیلیاں ڈھولک پیٹتی رہیں تو کئی بار مجھے ایسا لگا کہ مجھ میں اور سرخ وسیاہ کی ماتیلا میں تو کوئی فرق ہی نہیں۔ وہ بھی سوچتی تھی' قسمت نے مجھے کون سی خوبی نہیں دی۔ حسب ونسب' مال ودولت' حسن ذہانت' محبت.... مگر ایک خوشی میسر نہیں۔ پھر اُس کا بھی خاندانی حسب ونسب اور برادری تھی جو اُس کے اور ژولیاں کے آڑے آئی تھی اور اُس پر بھی بار بار ندامت کے دورے پڑتے تھے کہ میں کیا کر رہی ہوں اور جب اُس کے باپ کو پتہ چلا تھا تو وہ کیسا پاگل ہوگیا تھا۔ غم وغصے سے کہ میں دنیا کو کیا منہ دکھاؤں کہ میری بیٹی نے کس کو پسند کیا ہے۔ میں تو اُسے ڈچز بنانے کو تھا مگر ماتیلا میرے سے زیادہ لکی تھی کہ اُسے ژولیاں حاصل تو تھا اُس کے سامنے رہتا تھا اور اُس کے ہونے والے بچے کا باپ تھا۔ کبھی مجھے لگا کہ میں تو آگ کے دریا کی نرمل ہوں یا چمپا جو دیویوں کی طرح تھیں' آوارہ نہیں تھیں مگر مشکل یہ تھی کہ وہ بھیا صاحب اور گوتم نیلمبر میں فرق محسوس کرسکتی تھیں۔ اور وہ تو ملا کسی کو بھی نہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ کوئی مجھے قراۃ العین حیدر کے بارے میں بہت کچھ بتائے' وہ اتنا اچھا لکھتی ہے' جادو کرتی ہے ذاتی زندگی میں کیا ہے' کون ہے۔ وہ بھی سید زادی ہے اور مجھ سے کہیں زیادہ سر پھری اور یقیناً خوبصورت بھی ہوگی مجھ سے کہیں زیادہ۔ مجھے خیال آرہا تھا کہ کرشن کی بھی تو کتنی لاتعداد گوپیاں تھیں مگر رادھا تو بس ایک ہی تھی ناں اور وہ کسی بھی گوپی سے جلتی نہ تھی۔ اگرچہ تم کرشن ہو میرے لیے لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے رادھا نہیں سمجھتے.... چلو کیا فرق پڑتا ہے تم تو

کرشن ہی رہو گے ہمیشہ۔

ابھی خیال آیا ہے کہ میں اس زندگی میں کچھ نہیں تو تمہاری وہ سُرخی مائل خوبصورت آنکھیں بھی نہ دیکھ سکوں گی جو فضول امریکن لڑکی تک نے دیکھ لیں۔ اور آپ کو کبھی بھی یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ ایک سید زادی (اپنی دنیا میں شہزادی) چاہے کہیں بھی رہے کسی کے ساتھ.... اُس کے دل میں آپ رہتے ہیں خدا کی طرح کہ اِس سے زیادہ وسیع اور گہری اور شدید محبت کا تصور، ہر لمحے کی یاد اور محبت اور ساتھ رہنے کا تصور انسانوں کے پاس اور کوئی نہیں۔ خدا حافظ۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

میرا خیال ہے کہ ستمبر کے بعد مجھے فرصت ملے گی تو میں ضرور کچھ لکھوں گی۔ آپ کا خیال، آپ کی یاد مجھے ہر لمحے کچھ نہ کچھ لکھنے کو اُکساتا رہتا ہے۔ ذہن حسن اور رومانیت سے بھر جاتا ہے.... اور آپ کو خط تک نہیں لکھ سکتی۔ پچھلے دنوں ایک ہندوستانی ادیب کا افسانہ پڑھا بہت خوبصورت۔ اس میں بھی رُودین جیسا کردار تھا اور شادی شدہ اور ایک بچی کا باپ۔ میں نے بے اختیار سوچا کہ یہ تمام رُودین ایک جیسے کیوں ہوتے ہیں۔

موسم یہاں بہت خوبصورت ہو رہا ہے ان دنوں۔ آپ تو کہتے تھے کہ کوئی محبت کرنے والا ساتھی ساتھ ہو تو موسم کا حسن بڑھ جاتا ہے.... مجھے تو پچھلے سال کے مقابلے میں کچھ کم ہی لگ رہا ہے۔ اس سال اس موسم کا حسن۔ ناصر پر آپ کی بات شاید صادق آتی ہے۔ وہ ہر وقت مسکراتا، گنگناتا، خوشی سے بھرا بھرا نظر آتا ہے۔

تم نے اپنی محبت سے جو آرام دہ گوشہ میرے دل میں بنا لیا ہے مجھے اس سے نجات کبھی نہ ملے گی۔ زندگی اتنی پُرسکون ہے.... مگر کمی صرف تمہاری ہمیشہ رہے گی۔ تمہارا خیال کبھی تو ہر کوفت مٹا دیتا ہے اور کبھی دل کو اتنا ''تانگ تانگ'' کر دیتا ہے کہ اس کی مانگ رلا دیتی ہے۔ یوں تو زندگی بھر میرے لیے خوشیوں اور آنسوؤں

کا کھیل بنے رہو گے۔ چاہے میں خط کبھی بھی نہ لکھوں (ایسا تو خیر ممکن ہی نہیں) لیکن تم سے باتیں کرنے کی آرزو کبھی نہیں مر سکتی۔ اس قدر اعتماد آپ کو خود پر ہونا چاہیے اپنے والدین، بیوی بچوں، بہن بھائیوں کے علاوہ ایک اور ہستی کے لیے بھی ناقابل فراموش ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ خدا کرے آپ ہمیشہ خوش رہیں۔

پتہ نہیں کب پڑھے ہوئے الفاظ یاد آ گئے ہیں اور اپنے دل کی آواز لگتے ہیں

''میری محبت کو اب بھی تمہاری تلاش ہے۔ کیونکہ یہ جذبہ جو میرے دل میں ہے صرف تمہاری روح کے لیے تخلیق کیا گیا ہے اور میرا حسن تمہاری آنکھوں کے لیے۔ میں تمہاری منتظر ہوں اور روتی ہوں (اگرچہ اب میں تمہاری منتظر نہیں ہوں) اور تم اپنی محفلوں میں گم ہو۔ کوئی راج ہنس بھی میرا پیغام تم تک نہیں لے جاتا۔ تمہیں میری خبر نہیں ہوتی۔''

''نتالیہ''

تسلیمات!

خدا کرے کہ اس تمام عرصے میں آپ بالکل بخیر اور خوش و خرم رہے ہوں.... اور اپنے بارے میں مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے.... ع تو نے مجھ کو کھو دیا میں نے تجھے کھویا نہیں۔

سوچتی ہوں نہ جانے کیسے لوگ ہوتے ہوں گے جو ماضی کی ملاقاتیں تک بھول کر خوش و خرم نئی زندگی میں گم رہتے ہیں۔ میں تو صرف خوابوں کو بھی نہیں بھول سکتی۔ اگر کہیں کوئی ملاقات بھی ہوئی ہوتی تو نہ جانے کیا ہو گیا ہوتا۔

میرا دل تو اب بھی بالکل ویسا ہی ہے۔ اب بھی تمہارا خیال آتے ہی مجھے اپنا فرض، اپنی حیثیت، اپنا مقام، اپنی زندگی کی تبدیلی کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ میں تو بس پھر سرتاپا محبت بن کے رہ جاتی ہوں صرف تمہارے لیے۔ بلکہ نہیں محبت یا چاہت یہ الفاظ میرے دل کا مفہوم صحیح طرح ادا نہیں کر سکتے۔ تمہارے لیے تو ہمیشہ سے وہ کچھ محسوس کیا ہے جو صرف خدا کے لیے کرنا چاہیے۔ ایک ایسا جذبہ جس میں ادب، محبت، اطاعت، اعتماد سب کچھ شامل ہوتا ہے۔ یہ چاہت سے بھی آگے کوئی چیز ہے۔ اگر صرف چاہت ہوتی تو میں بھی نئی زندگی کے بعد تمہیں بھول جانے میں

کامیاب رہتی۔ میں نے تمہیں کبھی دیکھا تک نہیں اس کے باوجود یہ جذبہ اُسی طرح قوی اور شدید ہے اور میں جانتی ہوں کہ ہمیشہ اسی طرح رہے گا کیونکہ.... خواب کبھی نہیں مرتے۔ انسان کہیں بھی رہے کسی کے ساتھ بھی رہے خواب دیکھنے کو تو اس کا ذہن ہمیشہ آزاد ہوتا ہے اور میں نے تو خواب ہی واحد دیکھا.... اور اس خواب سے خواب در خواب ذہن بنتا گیا۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ''محبت تو زندگی میں ایک حادثے کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ حادثہ صرف ان لوگوں کو پیش آتا ہے جو اعلیٰ ظرف ہوں۔'' تو یہ خیال مجھے آج بھی مسحور و سرشار کر دیتا ہے کہ میرے ساتھ یہ حادثہ پیش آچکا ہے۔ میرے پاس بھی گلاب کے چند شگوفے ہیں جو اگرچہ کھل کر پھول نہ بن پائے لیکن اُن کی تازگی، مہک اور جوانی لازوال ہے، روح کے ہر ذرّے کو سرشار کرنے والی۔ مجھے ماتیلا کی طرح خیال آتا ہے کہ میرے پاس سب کچھ تھا.... مگر دل کی بے لطفی نہ جاتی تھی۔ پھر محبت اپنی تمام تر کرشمہ سازیوں کے ساتھ مجھ پر حکمران ہوگئی اور مجھے پتہ چلا کہ یہی ایک نعمت تھی جو مجھے ابھی تک نہ مل سکی تھی۔

لیکن آپ میری عظیم مسرت ہی نہیں عظیم محرومی اور دُکھ بھی بن جاتے ہیں کبھی کبھی۔ جب سب سے ہر چیز سے سخت اُکتا جاتی ہوں.... اور بالکل تنہا پاتی ہوں خود کو۔ اور پتہ نہیں کیوں ایسی شدید محرومی اور بے بسی کا احساس ہوتا ہے کہ.... آنسو بے اختیار بہتے جاتے ہیں بے بسی کے اور خیال آتا ہے اوہ خدایا.... میں اُسے کبھی دیکھ بھی نہیں سکتی۔ دیکھ بھی نہیں سکتی ایک لمحے کو بھی نہیں۔ میں اپنے خاندان کی بڑی نک چڑھی قسم کی اکڑ بازی لڑکی تھی۔ اپنے اعلیٰ خاندان، اعلیٰ دماغ، اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ حسن سب پر بے طرح نازاں.... مگر سب کچھ کتنا بے معنی اور بے کار ثابت ہوا.... کہ میں صرف ایک دفعہ بھی اُسے دیکھ بھی نہ سکی اور وہی عام گھریلو بیوی بن کر رہ گئی جیسی کہ میری کزنز ہیں۔ اب جو اُن کی خوشیاں ہیں وہی میری۔ مجھے آپ کے الفاظ یاد آتے ہیں.... بالکل ایسے ہی الفاظ ژولیاں بھی ماتیلا سے کہتا تھا کہ ''شادی کے بعد تمہاری رومانیت پسند روح کو رفتہ رفتہ تمہارے نوجوان شوہر کی حقیقی خوبیاں سمجھ آنے لگیں گی۔ تم بھی صبر و شکر کے ساتھ ان چیزوں کا لطف لینے لگو

گی جنہیں دنیا خوشی کے نام سے تعبیر کرتی ہے یعنی عزت' دوست' گھر' بچے' شوہر....
آج سے پندرہ سال بعد تمہیں اپنی یہ محبت اور دیوانگی حماقت معلوم ہوگی۔ ایسی حماقت جو معافی کے قابل تو ہے مگر پھر حماقت ہے۔ میری جان وہ حسن جو تمہارے دل میں اس وقت موجود ہے اُس زمانے تک ٹھنڈا پڑ چکا ہوگا۔''

ہوسکتا ہے کہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو کیونکہ آپ نے بھی مجھے ایسا ہی لکھا ہے کئی خطوں میں۔ لیکن اتنا مجھے معلوم ہے کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گے۔ میرے دل کی سب سے بڑی مسرت بن کر بھی اور سب سے بڑی محرومی اور حسرت بن کر بھی۔

ویسے ناصر بہت ہی اچھا ہے....اور افسوس ہوتا ہے کہ میں اُسے بلاوجہ پریشان کر دیتی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے اپنی شدید محرومی اور دُکھ اور تنہائی کا احساس ہوتا ہے اور میں بغیر کسی وجہ کے رونا شروع کر دیتی ہوں.... بے چارہ ناصر اور اُس کے گھر والے (ویسے ہم دونوں اکثر گھر والوں سے چھپا لیتے ہیں یہ بات۔ انہیں خواہ مخواہ تشویش ہو ورنہ) سمجھتے ہیں کہ میں گھر جانے کے لیے اُداس ہوں اور ناصر کہتا ہے چلو آؤ گھر چلیں۔ ہم پیدل ہی چل پڑتے ہیں اور راستے میں واقعی کھیتوں' پہاڑیوں اور ہواؤں اور خوبصورت مناظر کے درمیان ناصر کے ساتھ چلتے ہوئے آپ خود بخود ہی محرومی کی بجائے سرشاری بن جاتے ہیں میرے لیے اور میں خود بھی حیران ہو جاتی ہوں کہ کیا واقعی ابھی کچھ دیر پہلے میں رو رہی تھی اتنی تنہا اور اداس تھی۔ پتہ نہیں میری فطرت کیا ہے' میں خود کو سمجھ نہیں سکتی۔ البتہ بس اتنا جانتی ہوں کہ میں ایک سخت رومانیت پسند روح ہوں اور اس روح کی سب سے بڑی حسرت اور سب سے بڑی مسرت صرف آپ ہی ہمیشہ رہیں گے۔

اگر آپ ان دنوں مجھے دیکھ پاتے تو بہت ہنستے۔ اتنے تعویذ ہیں گلے میں۔ گلا بھرا ہوا.... کیونکہ میں بیمار رہی ہوں ذہنی اور جسمانی دونوں طور پر۔ ذہنی طور پر تو جیسا بے ہوشی کا دورہ ویسے کی صبح پڑا تھا ایسے ہی تین چار اور بعد میں پڑے۔ ڈاکٹر یہ سن کر کہ یہ شادی شدہ ہے بڑا حیران ہوا کیونکہ اس نے تشخیص کیا تھا کہ یہ ہسٹریا ہے اور اس لڑکی کی جلد شادی کر دینی چاہیے....لیکن سب سے بڑی بات یہ

ہے کہ خود میں نے اپنے آپ کو ہر پل سمجھایا' مصروف رکھا تو شکر ہے کہ اب تقریباً دو مہینے سے یہ دورہ نہیں پڑا....اور جسمانی پریشانی الگ.... مجھے کوئی شوق نہ تھا کہ اس قدر جلد....لیکن کیا کیا جائے۔ یہ اس قدر بے چین ہی کیوں ہوتے ہیں دنیا میں آنے کے لیے....آپ ہنسیں گے کہ بار بار شیشہ دیکھتی ہوں....کہ بھلا کیا میرے چہرے میں تبدیلی آئی۔ وہ کوئی نورانی ہالہ یا مقدس جذبہ چمکا یا نہیں چہرے پر یا اس کے گرد جس کے لیے پڑھا ہے کہ ''ماں'' کے چہرے پر نمودار ہو جاتا ہے....مجھے تو کچھ فرق نظر آتا نہیں ابھی تک۔

میں تنہا رہنا چاہتی ہوں ان دنوں....تنہا یعنی صرف آپ کے ساتھ۔ آپ کے خیال' آپ کے تصور' آپ کے عکس' آپ کی تصویر کے ساتھ....تاکہ ''وہ'' بالکل ''خزانے'' جیسا ہو۔ آپ کی بھی یہی دعا ہے ناں....خدا کی قسم میں نے تو تمہیں بھلایا ہی نہیں کبھی....کسی دن بھی نہیں....کسی رات بھی نہیں....مگر تم نے تو شاید ایک دن بھی مجھے یاد نہ کیا ہوگا۔

ایک اور بڑی مصیبت ہے۔ دودھ پینا پڑتا ہے۔ زبردستی پینا پڑتا ہے اور اتنا زیادہ۔ مجھے تو کبھی بھی تھوڑا سا دودھ پینا بھی پسند نہیں رہا۔ سب کا خیال ہے کہ میں نے شادی کے بعد وزن گھٹایا ہے اور کمزور نظر آتی ہوں پہلے کے مقابلے میں۔

بھئی آپ تو صرف رُودین ہی نہیں رُوسی ادب کا ایک خوبصورت انسانی کردار ہیں۔ ایک طویل رُوسی افسانہ ''ابر گزراں'' مجھے بہت پسند آیا۔ اور مجھے بالکل اپنی تصویر لگا۔ اس میں بھی ہیرو ایک مشہور سٹیج ایکٹر اور ادیب اور لینا سے عمر میں کئی سال بڑا اور شادی شدہ ہے....اور یہ کردار بھی بالکل حیرت ناک طور پر آپ جیسا ہے۔ ایک جگہ وہ لینا کو کہتا ہے کہ ''لینا میں تم سے محبت تو کرتا ہوں....لیکن کاش تم جان سکو کہ جب تمہاری محبت کا خیال کرتا ہوں تو کتنا زیادہ بے چین ہو جاتا ہوں....ایسی بے پناہ محبت کا مستحق ہونے کے لیے میں نے کیا کیا ہے....تم مجھے جانتی تک نہیں ہو....تمہیں بالکل معلوم ہی نہیں کہ میں صحیح معنوں میں کس قسم کا آدمی ہوں....ٹھیک اسی طرح جیسے کہ میں نہیں جانتا ہوں کہ تم دراصل کیسی ہو۔''

تمہاری ہی ''نتالیہ''

حرف کی دنیا ایک صحرا ہوتی ہے جس کے ذرّے ایک دوسرے میں جُڑتے چلے جاتے ہیں اور اپنا مفہوم واضح کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہیں پڑھنے والا ایک ایک ذرّے پر آنکھیں رکھتا اس صحرا میں سفر کرتا چلا جاتا ہے۔ اس میں اتنا گم ہو جاتا ہے' محو ہو جاتا ہے کہ اسے دھیان ہی نہیں رہتا کہ اس صحرا کے باہر جو دنیا ہے' وہی حقیقت ہے اور یہ صحرا اس کا سراب ہے.. وہ ان ذرّوں کی تسبیح کے دانوں میں مگن تھا اور جب لہسن اور پیاز کی بو میں گندھی انگلیاں اس کے شانوں پر اتریں تو وہ اپنی صحرائی گمشدگی میں سے چونک کر باہر آ گیا..

''تم دیر سے چپ ہو..''

''ہاں..''

''ایک سوال کے جواب کے لیے اتنی دیر.. اور مائنڈ یو یہ صرف ایک سوال ہے درخواست نہیں..''

''تم بھی تو دیر سے چپ ہو..''

''صرف اس لیے کہ تم یہاں موجود نہیں تھے.. مجھ سے جدا بے خبر ہو چکے تھے.. بے جان اور بے پروا ہو چکے تھے تو میں کیسے کلام کرتی..''

''ایک انسان وقت کی غار میں پچیس برس پیچھے لوٹ جائے تو وہ کیسے لمحۂ موجود میں موجود ہو سکتا ہے.. میں تمہارے خطوں کے حروف کی لڑی میں پرو دیا گیا تھا..''

''مجھے شرمندہ نہ کرو..''

''تم نے ان دنوں جو کچھ مجھے لکھا اس پر شرمندہ ہو؟''

''مجھے کیا یاد کہ میں نے ان دنوں میں کیا کیا لکھا.. انسان جو کچھ آج لکھتا ہے وہ سب اگلے ماہ نہ سہی اگلے برس تک متروک ہو جاتا ہے.. پچیس برس تو بہت عرصہ ہوتا ہے.. میں اس حوالے سے کیسے شرمندہ ہو سکتی ہوں.. اگر ہوتی تو یہاں تمہارے سامنے کیسے آتی اور ایک سوال کے ساتھ کیسے ہوتی.. لیکن لکھے گئے ہر حرف کو لوحِ محفوظ نہیں سمجھنا چاہیے.. صرف اس کی اجتماعی روح پر دھیان دینا چاہیے.. تم تذبذب میں ہو.. عقیدے کا مسئلہ ہے یا..''

''مجھے عقیدے کے بارے میں چنداں فکرمندی نہیں.. لیکن تم میں عقیدہ بدل دینے کی خصلت کا شائبہ ہے.. تم ایک جانب ایک سید زادی ہونے پر تکبر کرتی ہو اور دوسری طرف ایک صلیب کو سینے سے لگائے رکھتی ہو..''

''مرد مختلف نہیں ہو سکتے..''

''نہیں؟''

''ہاں.. ہر مرد کسی نہ کسی لمحے ناصر بخاری ہو جاتا ہے.. حاکم اور ڈکٹیٹر... بخاری نے بھی پہلی شب یہی ہنگامہ کھڑا کیا تھا کہ یہ صلیب.. اور تمہاری خصلت بھی یہی پوچھتی ہے.. ایک ایسا سوال جس سے میں تنگ آ چکی ہوں..''

''آئی ایم سوری..''

''نہیں تمہیں افسوس نہیں صرف میرا دل رکھنے کے لیے کہ میں اتنی دور سے صرف تمہارے لیے آئی ہوں تم ایسا کہہ رہے ہو.. بہت سے لوگ جو بہت شرعی اور پابند ہوتے ہیں اپنے گھروں میں گندھارا یا گپتا عہد کے مجسمے رکھتے ہیں جو ان کے ذوق جمال کو.. ان کی نگاہ کو تسکین دیتے ہیں لیکن.. وہ انہیں پوجتے تو نہیں.. ہاتھ جوڑ کر ان سے مرادیں تو نہیں مانگتے.. ان کے چرنوں میں پھول تو بھینٹ نہیں کرتے۔ میں بھی اس صلیب سے کچھ نہیں مانگتی.. اسے اپنے ہونٹوں سے لگا کر کوئی مراد نہیں مانگتی.. یہ محض تسکین ہے.. میرے عقیدے میں داخل نہیں ہوتی.. کوئی اور اعتراض..''

''آئی ایم سوری..''

''کیا ہم صرف فروعی مسائل میں الجھے رہیں گے یا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم الجھے رہیں اور اصل کی جانب نہ لوٹیں' راستے میں ہی رہ جائیں؟ میں پھر بتا دوں' میں سوالی نہیں ہوں.. درخواستی یا گداگر نہیں.. درخواستی اور گداگری ایک سید زادی کے حضور ہوتی ہے اس لیے تم صرف ''ہاں'' یا ''نہ'' کہہ سکتے ہو..''

جولاہے کے تانے پیٹے میں یہ سب سے بڑی اٹک تھی..

سب سے دل آزار گانٹھ تھی جو کھیس کی بناوٹ میں رکاوٹ بن گئی تھی..اگرچہ دھاگے تو سب کے سب اُلجھے ہوئے تھے پھر بھی وہ قدرے مشقت سے اس اُلجھاؤ کو سلجھاتا کھیس بُنتا جاتا تھا..

لیکن اس ایک گانٹھ نے اُس کی کھڈی کی کھٹا کھٹ کو روک دیا تھا..

وہ شائد آگاہ نہیں تھا کہ..

سینہ کوبی..

ورق کوبی..

اور کھڈی کی کھٹ کھٹ ایک ہی سُر کی مختلف آوازیں ہیں..

اور یہ سب کی سب شرک کے زُمرے میں آتی ہیں..

جس گانٹھ میں.. چاندی کی ایک صلیب..زین العابدین کی آل اولاد.. مارکس اور لینن..اور پھر رُودین بندھے ہوں وہ بھلا کیسے کھڈی کو روانی سے چلنے دے سکتی ہے..

محمد علی ڈاکیا بھی اس گانٹھ کو کھولنے میں مددگار ثابت نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ محض ایک ہرکارہ تھا..اُس کا کام گانٹھیں کھول کر کھڈی پر بُنے جانے والے کھیس کی راہ ہموار کرنا نہیں تھا..

اُسے تو پوسٹ ماسٹر نے ایک خط پہنچانے کے لیے بھیجا تھا..

کس کا خط..کس کے نام..یہ اُس کا مسئلہ نہ تھا..

وہ بھی..ڈاکیا..ایک بڑی گانٹھ میں بندھا ہوا بے اختیار اور بے بس تھا..

صرف وہ جس نے اس گانٹھ کو باندھا تھا..کھول سکتا تھا..

معاشی معاملات کچھ پیچیدہ ہو رہے تھے..

پچھلے جنم میں کہیں ایک آسودگی سے لدا پھندا گھر تھا جس کے ایک الگ سے کمرے میں اُس کا بسیرا تھا.. چاروں بیٹے برسرروزگار تھے.. تین اپنی سرکاری ملازمت کے گریڈوں کا حساب کرنے میں مشغول رہتے تھے اور چوتھا جو سب سے چھوٹا تھا اور جس نے شائد اُن کے لاڈ پیار کے باعث پڑھائی کی جانب کبھی توجہ نہ کی تھی اور سرزنش کرنے پر اگر وہ کچھ توجہ کر بھی لیتا تو یہ توجہ کچھ دنوں میں پھر سے بھٹک جاتی.. اُس کے دو ہی جذبے تھے پتنگ بازی اور تازہ ترین ماڈل کی کاریں جو اکثر اُس کے پاس دکھائی دیتیں اور پھر ایک مختصر مدت میں بدل جاتیں.. وہ اُسے تو یہی کہتا کہ یہ کار... کیونکہ اُس کے اپنے ذاتی وسائل تو اتنے بھی نہ تھے کہ وہ اُسے کوئی بھی کار خرید کر دے سکتا تو وہ یہی کہتا کہ یہ کار.. تو میرے فلاں دوست کی ہے جو میں چند روز کے لیے مانگ کر لایا ہوں.. اور یہ کار ایک مکینک نے یہ جان کر کہ میں کاروں کو پرکھ سکتا ہوں مجھے ٹیسٹ کرنے کے لیے دی ہے.. لیکن اُسے خدشہ تھا کہ وہ یہ کاریں مانگ کر نہیں لاتا تھا.. ایک بار جب اُس نے اپنی بیوی سے بنت نئی کاروں کی آمدورفت کے بارے میں اپنے خدشے کا اظہار کیا تو اُس نے سر جھکا کر کہا تھا'' جوان اولاد کے ساتھ سوال جواب کرو گے تو وہ ساتھ چھوڑ دے گی.. کیا یہ کافی نہیں کہ ہمارے تین بیٹے ایسی سرکاری ملازمتوں پر فائز ہیں جہاں وہ تنخواہ کے سوا بھی بہت کچھ حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہیں.. کاروں کے بارے میں اسے سرزنش نہ کرنا..''

اُس کی بیوی اولاد کی محبت کے آگے ہتھیار ڈال چکی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ بیٹا کبھی کبھار چار پانچ روز کے لیے کوئی بہانہ بنا کر غائب ہو جاتا ہے.. جاتا اپنی تازہ ترین ماڈل کی کار میں ہے جو واپسی پر اُس کے نیچے نہیں ہوتی.. اور ہمیشہ اُس کے لیے کوئی قیمتی تحفہ لاتا ہے..

وہ چاروں ماں کی سالگرہ کو یاد رکھتے تھے..اُسے ''تم دنیا کی عظیم ترین ماں ہو'' کے کارڈوں کے ہمراہ پھولوں کے ڈھیر اور بیس پاؤنڈ کا ایک کیک پیش کرتے تھے اور ''ہیپی برتھ ڈے ٹویو'' چلاتے گاتے اتنے زور شور سے تھے کہ ہمسایوں کو بھی خبر ہو جاتی تھی لیکن وہ چاروں..نہ اُس کے..نہ اُس کی بیوی کے بس میں تھے..اپنی زندگیوں میں آزاد اور اُن دونوں سے بے پروا تھے..

پھر بیوی ایک پل میں تھی اور دوسرے پل میں وہ اُسے قبر میں اُتار رہا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد چاروں بیٹے جب فکرمند اور پُرتشویش نظروں سے اُس کے نیم تاریک کمرے میں..اُسے صوفے پر اونگھتا ہوا پاکر اُسے دیکھتے تھے تو اُسے معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ اُس کے ہاتھوں کو دیکھ رہے ہیں..

ابھی کچھ عرصہ ہوا تھا اُسے ملازمت سے فارغ ہوئے جب بہت نامعلوم انداز میں... اُس کے عزیزوں یا دوستوں کو تو احساس نہ ہوا..اُس کے بیٹوں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ اپنے کمرے سے باہر آنے سے کتراتا ہے...ڈائننگ ٹیبل پر کم دکھائی دیتا ہے..بہانے تراشتا ہے..سر درد اور طبیعت کی گرانی کے جواز پیش کرتا ہے..گھر میں آنے والے مہمانوں سے ملنے سے گریز کرتا ہے..

اُس کا بیشتر وقت غسل خانے میں گزرتا تھا..

یہ اُس کا پسندیدہ ترین مقام تھا..غسل خانہ..اُس کا سفید سنک..پانی کے نل اور صابن..اور مٹی کا ایک جھانواں...جو ہر تیسرے روز تبدیل کر دیا جاتا کہ اُس کے دندانے گھس جاتے..

صابن کی کم از کم ایک ٹکیہ تو روزانہ صرف ہو جاتی..

بہت نامعلوم انداز میں اُسے پاکی اور ناپاکی کا خبط ہو گیا..اسی لیے وہ گریز کرتا تھا باہر جانے سے..لباس پر کوئی چھینٹ نہ پڑ جائے..جوتے آلودہ نہ ہو جائیں..وہ ایک نیا نکور تازہ اخبار بھی کھولتا تو اُسے وہم ہو جاتا کہ اسے چھونے سے کچھ جراثیم میری اُنگلیوں کے پوروں میں سرایت کر گئے ہیں اور وہ غسل خانے کا رُخ کرتا..رگڑ رگڑ کر ہاتھوں کو بار بار دھوتا..اُنہیں تولیے سے نہ پونچھتا کہ اُس میں بھی آلائش ہو سکتی تھی..واپس آتا تو فوراً ہی اُسے احساس ہوتا کہ صابن کی جو ٹکیہ استعمال کی تھی وہ بہت دیر سے وہاں پڑی تھی اس لیے صاف نہ تھی اور وہ پھر غسل خانے کا رُخ کرتا ایک اور ٹکیہ کا ریپر اُتار کر دوبارہ ہاتھوں کو دھونے لگتا..دھونے کے بعد اُنہیں جھانویں سے رگڑتا اور پھر صابن لگاتا..

اُس کی انگلیاں زخمی ہو چکی تھی..متواتر ہاتھ دھونے سے ہتھیلیوں کی پشت پر جو رگیں تھیں وہ پھٹنے کو آ رہی تھیں..

وہ کسی عزیز کی شادی کی تقریب میں بھی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اس لیے شریک نہ ہوتا کہ وہاں پر پانچ دس منٹ کے بعد ہاتھ دھونے کی سہولت میسر نہ ہو سکتی تھی.. خوراک اُس کے کمرے میں پہنچا دی جاتی..

اور یہ غذا صرف اور صرف شوربے پر مشتمل ہوتی.. آلو شوربہ.. بھنڈی شوربہ.. اور صرف شوربہ.. کیونکہ کوئی بھی ٹھوس غذا اُس کے حلق سے نہیں اُترتی تھی..

یہ سب کچھ ریٹائرمنٹ کے بعد ہوا ورنہ وہ ایک نارمل شخص تھا..

وہ اکثر نہایت سنجیدگی سے اپنی بیوی سے شکوہ کیا کرتا تھا کہ پرانے زمانوں میں آبادی اتنی مختصر تھی کہ ہر بستی سے نکلتے ہی کوئی گھنا جنگل.. نیلے تالابوں اور اُن کو ڈھکتے کنول کے پھولوں' اشوک کے درختوں اور بوڑھے برگدوں اور جانوروں اور پرندوں سے پُر جنگل شروع ہو جاتا تھا.. اور جو لوگ کچھ نا آسودہ ہوتے تھے یا زندگی سے اُکتا جاتے تھے وہ ایک پوٹلی کاندھے پر ڈال اُدھر چلے جاتے تھے.. اور اب تو بستیوں کے باہر بھی بستیاں ہیں' شہر ختم ہونے کا نام نہیں لیتے' آبادی ایک تسلسل کے ساتھ چلی ہی جاتی ہے تو ایک نا آسودہ اُکتایا ہوا شخص اب کیا کرے.. کدھر جائے..

بیوی اُس کے نفسیاتی مرض سے آگاہ تھی' وہ ہنس کر کہا کرتی تھی ''تم اپنے گھر کی آسائشوں کے اتنے عادی ہو چکے ہو کہ اگر ان دنوں بھی شہر کے باہر کوئی جنگل ہوتا اور تم ہم سے ناخوش ہو کر اُدھر نکل جاتے تو دو چار دن میں ہی.. مچھروں سے تنگ آ کر.. خاموشی اور تنہائی سے خوفزدہ ہو کر.. بیڈ ٹی نہ ملنے پر یا اپنے کموڈ کی سہولت نہ ملنے پر کانوں کو ہاتھ لگا کر گھر واپس آ جاتے..''

وہ اس جواب کو اپنی تضحیک پر معمول کرتا اور کئی روز تک بیوی سے رُوٹھا رہتا.. بیوی کے چلے جانے پر اُس کی پاکی اور ناپاکی کا خبط تو برقرار رہا' لیکن گھر چھوڑ کر کہیں بھی چلے جانے کا اُسے کبھی خیال نہ آیا..

چھ ماہ ہو چکے تھے اُسے نتالیہ کے جنگل میں آئے ہوئے..

پہلے روز ہی اُس نے اُس کے ہاتھوں کو دیکھ کر پوچھا تھا ''یہ زخم کیسے ہیں؟''

''یہ.. بس.. گھر میں ردّوبدل کرتے ہوئے.. فرنیچر اِدھر اُدھر کرتے ہوئے.. یہ خراشیں آ گئیں..''

''لیکن یہ خراشیں تو نہیں لگتیں' زخم ہیں..''

''خراشیں ہیں'' اُس نے تلخی سے کہا اور ہاتھ پرے کر لیے.. وہ اُس کو قطعی طور پر نہ جانتی تھی

ابھی پہلا روز تھا اس لیے چپ ہوگئی۔ لیکن آئندہ دنوں میں اُسے اُس کی آنکھیں محسوس ہوتی تھیں اپنی اُنگلیوں پر۔ وہ کچھ کہے بنا اُن خراشوں کے بارے میں پُرتشویش تھی۔ پھر وہ خراشیں مندمل ہوگئیں۔

نتالیہ سے پہلی بار ملنے میں اُسے تامل تھا یہی تشویش تھی کہ کہیں آس پاس کوئی باتھ روم نہ ہوا تو میں کیا کروں گا۔ کدھر جاؤں گا۔ وہ کیا سوچے گی اس کی اُسے پروا نہ تھی وہ خود کیا کرے گا یہ اُس کے لیے سوہانِ روح تھا۔ لیکن اُسے حاجت نہ ہوئی' کوئی بے چینی نہ ہوئی۔ گھر پہنچ کر وہ فوراً باتھ رُوم میں گیا لیکن ہاتھ دھونے کو اُس کا جی نہ چاہا۔

نتالیہ کی آمد کے بعد وہ پاکی اور ناپاکی کا خبط گم ہوگیا۔ بار بار ہاتھ دھونے کی خواہش گھٹ کر مرگئی اور اُس کی خراشیں مندمل ہوگئیں۔

تو معاشی حالات کچھ پیچیدہ ہوگئے۔ تنہا زندگی میں جوں توں کر کے گزر بسر ہو جاتی تھی مگر اب معاملات مختلف ہوگئے تھے۔ اگلے ماہ کے کرائے کے لیے۔ مختلف بلوں اور خوراک وغیرہ کے اخراجات کے لیے... گھریلو ملازم کی تنخواہ کے لیے رقم کم پڑتی دکھائی دیتی تھی۔

''تم نے مجھ سے پہلے کیوں نہیں کہا؟'' ناراضی اُس کے چہرے پر پھیل رہی تھی۔

''میں تمہارے پیسوں پر انحصار نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

''ایک عورت کے پیسوں پر۔''

''ہاں۔''

''عورت اتنی حقیر اور بے توقیر ہوتی ہے؟'' ناراضی کے ہمراہ غصے سے اُس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

''نہیں۔ بالکل نہیں لیکن۔''

''میں مالی طور پر اتنی آسودہ کبھی نہیں ہوئی جتنی اب ہوں۔ طلاق کے بعد! میرے پاس بہت سے شیئر ہیں' سیونگ سرٹیفکیٹ ہیں' جن سے ماہانہ اتنا منافع آتا ہے کہ ہم اُنہیں پاکستانی روپے میں بدل کر اگر جلاتے بھی رہیں تو بھی ہماری زندگی متاثر نہیں ہوگی۔ اگر تم انکار کرو گے تو تم یقیناً مجھے حقیر اور بے توقیر سمجھتے ہو۔''

اس گفتگو کے اگلے روز وہ باغِ جناح کے اندر گئے تھے۔

جہاں ایک شیر دھاڑا تھا۔

جہاں ایک اشارہ ہوا تھا۔

یہ نہیں کہ صرف جولاہے پر... بلکہ رُودین اور نتالیہ پر بھی وہ پچیس برس گزر چکے تھے..
لیکن ان برسوں کے گزر جانے کے باوجود..
جولاہی برنے کی پینگ سے نہیں اُتری تھی.. جھول رہی تھی..
ہاتھی عشق نے جو بدن کو روندا تھا تو اُس کی ٹیسیں بدستور اُٹھتی تھیں.. وہ خاوند اور اولاد کے دھاگوں میں بندھ کر کسی روایتی کھیس میں نہیں بُنی گئی تھی..

''تم مجھے ہی خط کیوں لکھا کرتی تھیں؟''
''اگر میں صدقِ دل سے بیان کر دوں تو تم شاید دُکھی ہو جاؤ.. سمجھ لو کہ یہ نصیب میں تھا..''
''شاید میں دُکھی ہو جاؤں لیکن اس کے باوجود خلش کی دُوری اگر دُکھ کا باعث بھی بن جائے تو میری ترجیح یہی ہوگی..''
''مجھے کسی نہ کسی کو خط لکھنا تھا.. جو مجھ پر گزرتی تھی.. ایک خانقاہی ماحول میں اگر تو میں سراسر محفوظ رہتی.. تو میں اُسی آب و ہوا میں پنپ جاتی.. کسی کو خط لکھنے کی حاجت پیش نہ آتی' ایسا کرنا میرے گمان میں بھی نہ گزرتا.. اگر گزرتا تو توبہ استغفار کرتی لیکن مجھے ایک اور ہوا لگ گئی.. کانونٹ' ساون اور رُوسی ادب نے مجھے برباد کر دیا.. میرے وجود کی اینٹیں اُکھڑنے لگیں۔ اگر میں کسی کو.. یا تمہیں خط نہ لکھتی تو مسمار ہو جاتی..''
''کسی نہ کسی کو؟''
''ہاں.. میں نے کہا تھا کہ تم دُکھی ہو جاؤ گے.. تمہیں برا لگے گا''

''تو میں محض ایک بہانہ تھا... جذبہ نہ تھا''

''بہانوں کو جذبوں میں بدلتے اور ڈھلتے دیر نہیں لگتی.. ہاں وہ پہلا خط جو میں نے کسی نہ کسی کو لکھنا تھا.. محض کسی کو لکھا.. اور یونہی بے دھیانی میں ہر کسی کو نہیں.. ایک ایسے کسی کو جو کانونٹ' ساون اور رُوسی ادب کے معیار پر پورا اُترتا تھا.. وہ بہت آسانی سے کوئی اور بھی ہو سکتا تھا.. لیکن یہ صرف نصیب میں تھا کہ اُس کسی میں سے تم سے رابطہ ہو گیا.. جیسے ایک لاٹری نکل آتی ہے..''

''تو میں ایک بہانہ تھا.. اور ایک اتفاق تھا..''

''تم تھے.. اب نہیں ہو''

''اور اب..''

''اب بھی تمہیں کسی دلیل کی ضرورت ہے.. تم مجھ سے جواب طلبی کرنے کی پوزیشن میں تو نہیں آ سکتے' کیونکہ یہ معاملہ تو سراسر یکطرفہ تھا.. تم مجھ پر کب توجہ دیتے تھے.. تمہاری توجہ تو کہیں اور جا کر ایسی ٹھہری تھی کہ وہیں پتھرا گئی تھی.. کہ نہیں؟''

''ہاں..''

''تو تم مجھ سے جواب طلبی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو..''

جب کبھی وہ اپنے دونوں بازو سمیٹ کر... ایسے جیسے برہنگی کو چھپانے کے لیے سمیٹے جاتے ہیں اُس کی جانب باتیں کرتی ہوئی جھکتی تو اُس کی ڈھلکنے کو چھاتیاں بھی سمٹ کر اُس کے کڑھائی دار ملتانی کرتے کو بھرتی ہوئی اُبھر کر نمایاں ہو جاتیں اور اُن کے درمیان میں چاندی کی صلیب کا ڈم گھٹنے لگتا اور اُس کی زمانوں کے گزر جانے سے بجھتی ہوئی آنکھیں اُن کے اُبھاروں پر ٹھہر جاتیں جیسے ایک ڈوبتا ہوا شخص بے کراں سمندر میں اُبھری ہوئی دو چٹانوں کو دیکھ کر اُن تک پہنچ جانا اور اُن کو چھونا چاہتا ہے..

بوڑھا.. اپنے پنجرے میں مدتوں سے ٹہلتا ببر شیر دھاڑنے لگا..

تُربت مراد کے مزار کے برابر میں جہاں باغِ جناح کا آخری بوڑھا برگد جس کے تنے کے اندر پچھلی شب کے جلائے ہوئے چراغ اب بھی جلتے بجھتے تھے اور اُس کی شاخوں اور داڑھیوں میں بندھے خواہشوں اور تمناؤں کے چیتھڑے سرسراتے تھے اُن کے برابر میں چڑیا گھر کا آہنی جنگلہ دیوار تھا جس کے پرے مدتوں سے اپنے پنجرے میں بند.. ٹہلتا ہوا.. وہ بوڑھا ببر شیر دھاڑنے لگا..